زنجیر روز و شب
سعیدہ گزدر

زنجیرِ روز و شب

کسی مسافر کو

اب دماغِ سفر نہیں ہے
یہ وقت زنجیرِ روز و شب کی
کہیں سے ٹوٹی ہوئی کڑی ہے
یہ ماتمِ وقت کی گھڑی ہے۔

———— : فیض احمد فیضؔ

زنجیرِ روز و شب

سعیدہ گزدر

حارث اور عائشہ کے نام

مصنف	سعیدہ گزدر
ناشر	پاکستانی ادب پبلی کیشنز
مطبع	اشتیاق پرنٹنگ پریس
سرورق	رفیق احمد
اشاعت اول	فروری ۱۹۸۶ء
قیمت	۱۵ روپے
ملنے کا پتہ	پوسٹ بکس نمبر ۱۳۸۲ کراچی

فہرست

کبھی کبھی

کبھی کبھی
اے پیار....
جو تیرے نام پہ
درد سے اپنا رشتہ جوڑے
دار چڑھے، سنگسار ہوئے
تنہائی اور اذیت گاہوں میں
جل مرے، برباد ہوئے۔

ہاں اے پیار
کبھی کبھی
غم کے وہ ساتھی
کیا یاد آتے ہیں ؟
کچھ تڑپاتے ہیں ؟
یا ریت پہ گرتی اوس کی مانند
نام و نشاں چھوڑے بنا
نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں
دل سے مٹ جاتے ہیں۔

بچے جب مرتے ہیں

(قصوری اسٹیشن پر مرنے والے نوجوانوں کے نام)

خوں جو بہا وہ کس کا تھا؟
بچوں کا جو بچے تھے
اپنے رستے جاتے تھے۔

کچی عمروں میں
کومل ہاتھوں میں
خنجر اور بندوقیں
کس نے دیں؟

ہنسنے اور گانے کے
رقص میں مست تھرکنے کے
آزادی کو گلے لگانے کے

یہ رسن
کیوں اتنی جلدی مٹ جاتے ہیں؟

جاں گنوا کے
خوں بہا کے
یہ بچے
تم سے اور مجھ سے
جذبوں کی سچائی مانگتے ہیں۔

جذبے گر سچے ہوتے
کیوں روحوں پہ تالے پڑتے
کیوں لفظ مردہ ہوتے
کیوں عشق ساکت ہوتے۔

بچے جب مرتے ہیں
کھیتوں سے دھواں اٹھتا ہے
شہروں میں لہو بہتا ہے
گھر کس کا جلتا ہے
کس دل پہ آرا چلتا ہے
کیا یہ بھی سوچا ہے؟
خون جو بہتا ہے

سر جو کٹتا ہے
وہ کس کا ہے
کیا یہ بھی جاننا ہے؟

بچّے تو پھر بچّے ہیں
میرے ہوں یا تمہارے
ان بچّوں کے
نازک اُجلے سینوں میں
نفرت کی فصل جو اگاؤ گے
خود اس کے سنگ کٹ جاؤ گے
ظلم کی جو آگ لگاؤ گے
خود اس میں جل جاؤ گے۔

بچے جب مرتے ہیں
غم کے بادل چھٹتے ہیں
غصّے اور نفرت کی بجلی
گرجتی ہے کڑکتی ہے
وحشت برساتی ہے
سنّاٹے کو بھسم کر جاتی ہے۔

اک بات بتاؤ

ہاں مری جاں
اِک بات بتاؤ
جب دل اندر سے کِھنچتا ہے
سینہ درد سے پھٹتا ہے
اور سر میں دھماکہ ہوتا ہے
تب میری طرح
کیا تم بھی برداشت کرتے ہو
کیا تم بھی سب کچھ سہتے ہو ؟

جب فرسودہ کٹّر سوچ کو
آگ لگانے
قتل کرنے

اور رَوندنے
کی خواہش
انگلیوں میں
اینٹھن بن کے اترتی ہے
اندر سے جھُلساتی ہے
تب اس گرمی اور آنچ کو
کیسے ٹھنڈا کرتے ہو
کتنی ذلّت پیتے ہو؟

دن میں کتنی بار
بے حسی بے شرمی کو
مجبوری بتلاتے ہو
جو کچھ کہ تم پہ گزرتی ہے
مصلحتوں کی خاموشی میں
لفظوں کی بھول بھلّیوں میں
کیسے چھُپاتے ہو
کیوں چھُپاتے ہو
اُسے چھپا کر
اپنے لئے کیا بچاتے ہو؟
یا میری طرح
فقط جوانی گنواتے ہو

وہ دلبری مٹتے ہو
جو اتنی محبوب تھی۔

ہاں مری جاں
اک بات بتاؤ
یوں ضبط کرتے کرتے
ٹھنڈی راکھ بننے سے پہلے
کتنا اچھا ہوتا
کہ ہم دونوں
ہاتھوں میں ہاتھ تھامے
آگے بڑھتے
حملہ کرتے
اور شان سے مرجاتے۔

"چلو آج"

چلو آج
اتنی پی لیں
کہ زباں سے
فقط
سچ ہی نکلے۔
وہ سب جو ہم چھپاتے ہیں
اپنے سے خوفزدہ
ہر آہٹ پہ
چوکنّے ہو جاتے ہیں
تحفّظ کے خول ہیں
عمر گنوا دیتے ہیں
آج اُسے
خالی جام کی مانند
آگ میں پھینکیں
روز و شب کی یہ زنجیریں

شیشے کی جھنکاریں توڑیں۔

چلو آج
اتنی پی لیں
کہ سانسوں کی رِم جھم میں
فقط
بے خودی اور مستی ہی گونجے
ہاں بس اتنا ہوش رہے
کہ وہ کانٹا
ہر دم جو چبھتا رہتا ہے
اِن لمحوں کی شدّت میں
نہ ٹوٹے نہ بجھے
اور دل کا یہ وعدہ
جاگے مضبوط رہے۔

اس کنگن میں

"چھوٹا سا تحفہ
کم قیمت اور ہلکا
نہ جانے کیسا لگتا ہے
پر جیسا بھی ہے
رکھ ہی لو
شاید یہ کنگن
تم کو کچھ یاد کرائے
سپنوں میں پیار کے دیپ جلائے"

اس کنگن میں
ہر موتی یادوں کا شیشہ ہے
پریم کی بیتی رُت کو مہکاتا ہے

کھنکتا ہے
کبھی ہنساتا ہے
اکثر بہت رُلاتا ہے
جی بھر کے تڑپاتا ہے۔

میں تکتی رہ جاتی ہوں
ہر رنگ میں تم دمکتے ہو
پلکوں پہ بسیرا کرتے ہو
راتوں کو جگانے آتے ہو۔

اس کنگن میں
کیا کچھ نہ پایا میں نے
وہ لمحہ جب ہولے سے
پیار کو تم نے اَمر کیا
زہر میں گھلی ہر سوچ کو
کڑواہٹ اور تلخی کو
دل کی ویرانی کو
اس جسم میں سے چوس لیا
اور دھیمے دھیمے سمجھایا
مانا کہ بہت اندھیرا ہے
ہر سمت گھٹن کا پہرا ہے

پھر خوف اور ذلّت کے دوزخ میں
ظلم اور کرب کے صحرا میں
پیار بھی کہیں مُسکاتا ہے
آشا کی چھب دکھلاتا ہے
جینے کی امنگ بن جاتا ہے۔

اس کنگن میں
پتھر سے تراشے کُندن میں
وہ دن چمکنے لگتے ہیں
جب ہلکی نشیلی گرمی میں
سانولی سجیلی شاموں میں
نرمی سے تم نے چاہا تھا۔
وہ نرمی اس سینے میں
صدیوں کا دکھ بن جاتی ہے
تمنّا جاں سے گزرنے کی
جبر سے ٹکّر لینے کی
دل میں سلگنے لگتی ہے
جسم میں سر پٹختی ہے۔

اس کنگن میں
ہر موتی درد کا رشتہ ہے

جنم جنم کا بندھن ہے
جیون کی گلابی آہٹ ہے
تم سچ ہی تو کہتے تھے
یہ کنگن گر پاس نہ ہوتا
وہ سب کچھ اک دھوکہ سا لگتا
کانچ کا اک کھلونا ہوتا
ریزہ ریزہ بکھرا ہوتا
ان آنکھوں میں کانٹے چبھتے
اور پچھتاوے کے آنسو بن جاتے۔

"تم نے لکھا ہے"

تم نے لکھا ہے
گولیوں کی برسات میں
ظلم کی یلغار میں
کتنے جوان مر گئے
جاں سے گزر گئے۔

موسم کی دھند میں
سردی کی شدت میں
مے خانوں کی نشیلی خوشبو میں
یہ سب کچھ جب پڑھتی ہوں
ہر پل میں مرتی ہوں۔

ہاں تم نے لکھا ہے
اِس خونی طوفاں میں
بل کھاتے اندھے جبر ہیں
نہ جانے کیا کچھ گزرے گا
تم آجاؤ تو شاید
یہ زہریلا لمحہ
بیت ہی جائے گا۔

کتنا شدید بلاوا ہے
یوں تم نے کیوں پکارا ہے؟
زندانوں سے آتی
اذیت خانوں میں بسی
وہ گھائل چیخیں
جب کانوں سے ٹکراتی ہیں
سرمئی بھیگے سناٹے میں
چلتے چلتے رک جاتی ہوں۔

شیشوں میں سجے
کپڑے، جوتے اور برقی آلے
بہار کی تازہ سیل ہیں
کتنے سستے ہو جاتے ہیں

کلچر، آرٹ اور موسیقی
سب مٹھی میں آجاتے ہیں۔

پھر اُن خونی گلیوں میں
نفرت سے بکھرے بازاروں میں
کیا لینے آؤں ؟
وہ سب کچھ اک اندھا سپنا ہے
جو تم نے گلے لگایا ہے
ہاں وہ تمہارا سندیسہ
آنسو بن کے ٹپکتا ہے
دل میں اک کانٹا تو چبھتا ہے
کچھ اندر ہی اندر مرتا ہے۔

پر سردی کی شدت میں
مہ خانوں کی نشیلی خوشبو میں
سینے میں اترتی تنہائی
ٹھنڈی سوچ اور بزدلی
ریشمی دہری زندگی
اب یہی اپنی حقیقت لگتی ہے
موسم کی دُھند میں چھپ جاتی ہے۔

جی کہتا ہے

تم کہتے ہو
یہ پاپ ہے
جی کہتا ہے
یہ بچّہ
جو میرا پیار ہے
کتنا انمول ہے۔

جس کوکھ پہ تم نے
کبھی لات ماری
کبھی پتھر پھینکے
کبھی گولیوں سے چھلنی کی۔
زخموں سے چھلنی اس کوکھ میں

تم نے جسے پاپ کہا
وہ جیون
کس مان سے رکھا ہے
چھاتی کی امرت دھارا پہ
کن جتنوں سے پالا ہے
راتوں کو بے کل ہو کے
اس کو بہلایا ہے۔

تم نے جسے باپ کہا
وہ پریم
یوں تم پہ وار نہ کرتی
شکتی سے بڑھ کر اپنی
ہر پل بلیدان نہ کرتی
یہ بچّہ
نہ پلتا، نہ بڑھتا
نہ اتنا من موہن ہوتا۔
اور ذلت پہ انساں کی
اک ابدی للکار نہ ہوتا۔

"خونی لفظ"

تعفّن سے بھری گلیوں میں
کیچڑ سے لت پت رستوں میں
بے خبری کے عالم میں
جو رہتے ہیں
ہاتھ پھیلائے
کشکول تھامے کھڑے ہیں۔
پانی کی اک بوند پہ
اکثر قتل ہو جاتے ہیں
بارش اور وباؤں میں
کیڑوں کی مانند مرتے ہیں

اسکول کی چھت اور دیوار تلے
کتنے بچے

دفن ہو جاتے ہیں۔
اس بربادی کو
وہ تابوت میں سجاتے ہیں
قسمت کا کھیل بتاتے ہیں۔
لفظوں کے انبار تلے
علم کو دفناتے ہیں۔
ہم جینے کی خاطر مرتے ہیں
وہ موت کے قانون بناتے ہیں

لفظوں کے اس خونی ناٹک میں
وہ کتنا خوں بہا دیں گے
کتنے گناہ معاف کروائیں گے
کتنوں کو پھانسی دے کے مٹائیں گے
تب جی پائیں گے۔
پھر بھی ہر پھندے میں
ایک گرہ
اُن کے نام کی پڑ جاتی ہے
نیندیں حرام کر جاتی ہے
حساب میں لگ جاتی ہے۔

"آدم کے نام"

" ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت"
فیضؔ

یہ تم نے کیا کیا ؟
میری محبت کا مذاق اڑایا
اُسے بدنام کیا
اور اب کہتے ہو
"شرمندہ ہوں"

آج میں تم سے
یہ سب کیوں کہہ رہی ہوں
کیا تمہارے ہاتھوں رسوائی بھی گوارا ہے ؟
یا کوئی رشتہ اب بھی باقی ہے ؟
محبت کا ؟
کسی توقع کا ؟
اعتماد اور مہربانی کا ؟
ہاں شاید
تھوڑی سی مہربانی کا۔

ہم ہاتھوں میں ہاتھ تھامے بیٹھے تھے
تم نے کہا "یہ ساتھ کبھی نہ چھوٹے گا"
اور اب یہ کہ
"زبردستی پیچھے پڑتی تھی
چھٹکارا مشکل تھا"

سچ کہو
کیا ایسی زبردستی ممکن تھی؟
جب جب تم یاد آتے تھے
تمھارے ہونٹ، تمھارے ہاتھ اور وہ تمھاری آواز
خوشیاں اور غم ساتھ لئے
اداس رنگیں لمحوں کی طرح
دل میں اترتی جاتی تھی
اور اب کہتے ہو "مجبوری تھی"۔

مجبور تو آہیں ہوتی ہیں
مجبور تو آنسو ہوتے ہیں
پیار کب مجبور ہوا؟
پیار تو خود ایک قوت ہے۔

تمھیں منانے، تمھیں پیار کرنے، تمھیں اپنانے

کی آرزو
میرے لئے اک جرم بنی
جیسے چوری، قتل یا جاسوسی۔
اتنے کیوں کمزور تھے تم
کہ وہ رشتہ
امر تھا جو بیج کی مانند
بہا دیا بے دردی سے
شہر کی گندی نالیوں میں
کھلی، بے آبرو لاش کی مانند
کہ گدھوں کی خوراک بنے۔
کیا تم نے اُن سے ڈر کے
میرا ساتھ چھوڑ دیا؟
لیکن میری جاں
وہ تو
ہم دونوں کی ناک میں تھے
اور میں ہار کر بھی جیتی تھی
کہ تمھارے خواب دیکھتی تھی
پھر کس خوف سے تم نے
ان خوابوں کے بیچ
شک کی، شبہ کی
بے رحمی اور بیزاری کی

نوکیلی دیوار کھڑی کی
کاش تم جانتے
کہ خوف
دشمن ہے پاکیزہ جذبوں کا
اور بزدلی
کھنڈر ہے سرپھری آوارہ خوشیوں کا
اور یوں کچلتے نہ پیروں تلے
اُس ٹمٹماتی یاد کو
جو میرے دل کا نور تھی
زندگی کی آنچ تھی
اک سہارا تھی
اک بھروسہ تھی
اس سنسان ویرانے میں
میرا بھی
اور تمھارا بھی۔

میری مجبوری اور رسوائی
بڑائی تھی کیا تمھاری؟
رُسوا تو تم بھی ہو
اور مجبور بھی میری طرح
پھر یہ چوٹ کیوں دی

کس جذبے کو آسودہ کیا؟

میرا محبت کرنا
ہنسنا مسکرانا
سر اٹھا کر چلنا
نظر ملا کر بات کرنا
گیت گانا، رقص کرنا
شہوت زدہ لگتا تھا تمھیں
اور آنسو بھری، فریادی، بے بس
قدموں میں جھکی آنکھیں ہی فقط
برتری کا بھرم تھیں تمھارا
تو اس بھرم کو
اب کفن میں لپیٹ لو
کہ میرا جنم دن
معجزہ ہے اک
تمھارے لیے اور تمھارے جہاں کے لیے۔

"دہشت گردی"

لاکھوں جمع ہوتے ہیں
ایک آواز ہیں کہتے ہیں
ہم بھوکے ہیں
ہم ننگے ہیں
اور سالوں سے بے کار ہیں
کیوں غلامی ہی اپنا مقدر ہے ؟

بندوق ٹھونک کے جرنل گرجے
پیچھے ہٹو
رستہ چھوڑو
گھروں کو پلٹو
شریفانہ درخواست لکھو
یہ دہشت گردی ہے
قانون کی خلاف ورزی ہے۔

ہم نے
سدا تمھارا
کہا مانا
ہر حکم پہ سر جھکایا
بچے کھچے ٹکڑوں پہ تمھارے
جیون بتایا۔
پر بچے سب کچھ جان گئے ہیں
اس غم کو پہچان گئے ہیں
ان چالوں سے ڈرتے نہیں
وہ اپنی جگہ سے ہٹتے نہیں۔

اس نالی کو دیکھتے ہو؟
تھوڑا بہت جو پاس ہیں ہے
اس کو ہی غنیمت سمجھو
اب بھی وقت ہے واپس پلٹو
ہل چلاؤ، فصل اگاؤ
وطن پہ جاں قربان کرو۔

پیچھے جانے کا وقت کہاں ہے
اور کھونے کو بچا ہی کیا ہے
فصل میں کیا ملتا ہے

غلامی میں ......
قربانی دینا مشکل ہے
اسی لئے ......
جمہوریت اور آزادی مانگتے ہیں
تمھاری طرح .....
جیالے اور بہادر کہلانا چاہتے ہیں۔

یہ بے دینی اور غدّاری ہے
ہر لفظ میں نفرت بھری ہوئی ہے
اب گنتی گننے کی باری ہے
دس .... نو .... آٹھ .....

کیا سب کی جان لے لوگے ؟

سات .... چھ .... پانچ

کیا تم گولی چلاؤ گے ؟
ذرا سی بات پر
اتنا خون بہاؤ گے ؟

چار .... تین .... دو .... ایک

بَلبی دبائی

اتنی لاشوں کا بوجھ
کیسے اٹھاؤ گے ؟
کہاں تک لے جاؤ گے۔

فائر...

رک جاؤ......
اتنی نفرت نہ پھیلاؤ

فائر.....فائر.....فائر.....

شہر میں لوگوں نے خبر سنی
چند گھائل ہوئے، دو مارے گئے
قصبوں میں کہیں کچھ گڑبڑ ہے
ڈاکوؤں کی شرارت ہے
باقی امن وامان ہے۔

"صبح ہونے والی تھی"

صبح کے دو بجنے والے ہیں
لیکن رات کا اندھیرا ہے
شدید حبس اور وحشت بھرا سناٹا ہے۔

قیدی کو سولی چڑھانے آئے ہیں
خوابوں میں ڈوبی گہری نیند سے جگانے آئے ہیں
اٹھو نہا دھو لو
اور جو کہنا ہے کہہ ڈالو۔
مالک تو گواہ ہے
یہ سزا نہیں قتل ہے۔

ہاتھا پائی دھکم پیل
کچھ گالی گلوچ

ہاتھ پاؤں باندھ دیئے
کھینچ تان کرے چلے
پھانسی کے تختے پہ
ٹھیک دو بجے
ہاں! ٹھیک دو بجے۔

تازہ پھلوں سے بھری ٹوکری
شام ہی کو آئی تھی
کتابیں، قلم اور روشنائی
ابھی تو......
ہاں ابھی تو بہت کچھ کرنا تھا
اب کچھ نہیں
اس کے بعد کچھ نہیں
ڈاکٹر نے نبض دیکھی
تندرست اور جیتا ہے
جلّاد نے پھندا کھینچا
جھٹکا لگا کوئی جھول گیا
ٹھیک دو بجے
ہاں ٹھیک دو بجے!

عطر، روئی کے پھلتے اور لٹھا

سانحہ دے کے چلو
اک مردے کو نہلانا ہے۔
گورکن قبر کھود رہا ہے
کس کی ہے؟
اک جنازہ آنے والا ہے
کڑے پہرے اور سنگینوں کے سائے میں
چوری چھپے دفنانا ہے۔

آہوں، فریادوں اور نالوں کا شور
ہوا میں اڑ جائے گا
دھوپ میں پگھل جائے گا
دھواں بن جائے گا
ہر سر ندامت سے جھکا رہ جائے گا
ٹھیک دو بجے
ہاں ٹھیک دو بجے!

زخم گہرے ہونے لگے
ناسور بن کر رسنے لگے
خونیوں پر پھول برسنے لگے
لفظ دور دور تک موت بن کر جھڑنے لگے
کرگس سینہ پھیلائے، گردن تانے چلنے لگے

چنبیلی کے پھول بوٹوں تلے روندے جانے لگے
فضا میں گیدڑ کی چیخ گونجنے لگی
فاختہ اور بھیڑیے میں گھسان کی چھڑنے لگی
ٹھیک دو بجے
ہاں ٹھیک دو بجے۔

-

کہیں رات کا اندھیرا تھا
کہیں صبح کا اجالا تھا
لیکن کیسا سناٹا تھا
دم گھٹتا تھا
جی پھنکتا تھا
ٹھیک دو بجے
ہاں ٹھیک دو بجے!

"آٹھ مارچ"

عورتوں کے عالمی دن کے نام

رکتے اور سہمتے ہوئے
آنسوؤں کے بیچ
میں نے پوچھا
ان دولت کے ہنگاموں میں
اس مردہ افراتفری میں
نفرت اور حقارت میں
سفاکی، خود غرضی میں

جنگ کے خونی شعلوں میں
کیا ہم مل پائیں گے؟

تم نے کہا
مارچ میں.....
ہاں مارچ میں

جب اُجلی نیلی فضاؤں میں
ہم دونوں اور بچے
پھولوں کے رنگیں دستے
دھرتی پہ جم جائیں گے
دھوپ اور چاندنی راتوں میں
ظلم کے وار روکیں گے
امن کی فصل اگائیں گے
اندیشوں کی پیلی بیماری سے
ہر روح کو آزاد کریں گے۔
دبی، گھٹی، ناکام، شرمندہ
ہر خواہش کو
اذیت کی بھٹی سے نکالیں گے

مارچ میں.....
ہاں مارچ میں ہم تم آئیں گے۔

نیک چلنی کا سند نامہ
بدچلنوں سے نہ لینا ہوگا۔
یہ دل اور یہ عہدِ وفا
خود اپنی گواہی ہوگا۔
تب اوشا کی لالی میں
یہ جسم اور صورت

خرید فروخت کی مورت
سوچ اور جذبے سے دمکے گی
گیتوں کو دل میں بسائے گی
پتوں کی تال پہ تھرکے گی۔
باہوں میں باہیں ڈالے
ہم آئیں گے
آزادی کی مالا پروئیں گے
مارچ میں
ہاں مارچ میں ہم تم آئیں گے۔

چودہ اگست

یاد ہے ؟
آج کا دن یاد ہے ؟
کھولتی سر کو جلاتی
جسم میں آگ لگاتی
وہ دوپہر!
جب محبت کی گرمی
پیار اور نرمی
سایہ بن کر
ہم دونوں کو
پناہ دیتی تھی۔

یاد ہے ؟
سمندر کے کنارے

سورج
سرخ تمتماتے چہرے والا
غصیلہ انقلابی نوجواں
جوشیلی لہروں کے آگے
سینہ تانے
چل رہا تھا
دمک رہا تھا۔

یاد ہے؟
کسی بار میں
کچھ پینے کے لئے
رکے تھے۔
میں نے پیچھے سے
تمہارے کاندھے پہ
سر رکھا تھا
مڑے بغیر ـــــ تم نے
بڑے اعتماد سے
بہت نرمی اور پیار سے
بالوں کو سہلایا تھا
گلے لگایا تھا۔
"آج میرے ساتھ پیو"

"دھوکہ نہ دینا....
"دھوکہ.....
نہیں نہیں...... ہرگز نہیں"

گلاس ٹکراتے ہوئے
جام چھلکاتے ہوئے
مسکرا کے کہا تھا
"محبت کے نام
آزادی اور شرافت کے نام!"
اور تم نے پوچھا تھا
"یقین نہیں آتا
کس لئے ؟ کیوں ؟
اتنی محبت کرتی ہو"
"کیوں اتنی محبت کرتی ہوں ؟
معلوم نہیں
بہت شاندار ہو
کتنے آزاد ہو۔
"ہاں !
تمہاری آزادی سے پیار کرتی ہوں
اسی لئے
دیوانہ وار مرتی ہوں"

آج تم وہاں بیٹھے ہو
مغربی ہواؤں میں
ڈالر کی جھنکاروں میں
دل کو ہتھیاروں کے شکنجے میں کستے ہوئے
محبت کو
قرض اور بھیک میں گھولتے ہوئے
پیتے اور جھومتے ہوئے۔

کہاں ہے محبت ....؟
نیویارک کے اونچے فلیٹوں میں
لندن کے سبزہ زاروں میں
پیرس کی معطّر راتوں میں
عرب کے ریتیلے صحراؤں میں
تیل کے کنوؤں اور محل سراؤں میں
بیروت کی بارودی فضاؤں میں
سیدون کی شہید ہواؤں میں
وطن کی مسجدوں اور دکانوں میں

غلامی میں ..... محبت؟
مجبور اور جکڑی ہوئی
شمشان کی راکھ ملے

بھوت بنی
ڈراتی ہے دھمکاتی ہے
اور منہ چڑاتی ہے۔

جس جذبے کی سچائی میں
سورج بھی رات کو ڈوبا تھا
وہ جذبہ
سجدے کرتے کرتے
آنسو پیتے پیتے
پھانسی کے پھندے میں
موت کے اندھیرے میں
بے حیائی کی چادر میں
منہ لپیٹ کر کہیں
چھپ گیا ہے کونے میں۔

یاد ہے ؟
نہیں پانے
اور تم پر اترانے کی خاطر
تاریخ اور سچائی سے رشتہ جوڑا تھا
کیا جھوٹ ہے، کیا سچ ہے
پہلی مرتبہ جانا تھا

آج
ان رُوپہلی رقصاں کرنوں پر
زہریلا کالا دھوُاں
سنسر کی سیاہی بن کر
جمتا جاتا ہے۔
پریس کانفرنس میں
مُلّا کے وعدے
جنّت کے میوے
نہ سونگھنے نہ چھونے کے
اور نہ کھانے کے
سوالوں کے جواب
کوڑے، چابک اور زنداں کی مار۔

"ہیلو ایمرجنسی؟"
"ہاں ایمرجنسی!"
"ابھی ابھی
پانی، بجلی اور ہوا......"
"پانی، بجلی اور ہوا؟....." اہانت آمیز ہنسی
"ایسے بہت سے لاشے
دن رات
یہاں وہاں تڑپتے ہیں"

" پھر ؟ "
"جلا دو انھیں "
" جلا دوں ؟
مگر ایندھن ؟ "
" بھاڑ میں جائے ایندھن " بہت جھنجھلا کر
" پھینک دو
گرگسوں کا ہجوم ہے
کھانے پر مجبور ہے "
" مگر .... ہیلو .... ہیلو
آپریٹر سنو تو .... "
بنگ ! کٹ !
اُف ! ٹیلی فون بھی مر گیا ۔

کاغذی مناروں پہ
چاند اور ستاروں پہ
کمند ڈالتے ہوئے
کشکول اچھالتے ہوئے
تن کر چلتے ہوئے
یہ مایۂ ناز نوجواں
توپ کے دہانوں کو
میری طرف گھماتے ہیں ۔

خوف کی نقاہت سے
میرے کومل ہاتھوں سے
تمہاری محبتوں کے پھول
جھڑتے چلے جاتے ہیں
مرجھا کر گرتے جاتے ہیں۔
لیکن اتنا شور ہے
اس قدر اندھیرا ہے
ان سوکھے پھولوں کی
خوشبو اور آہٹ بھی
دھواں دھواں ہو جاتی ہے۔

بازاروں میں، شہ راہوں میں
وعدوں کے ہار پہنے
دھمکیوں کی مار سہتے
آزادی کی ہنسی
کھسیاتے چہروں پہ لیے
روندتا، کچلتا ہوا
سہما اور خوفزدہ ہجوم
آزاد ہے آزاد ہے۔

یاد ہے؟
شوخ، خوش رنگ رلی[1]
تان لی تھی مل جل کر
اور سوچا تھا
موسیقی کی مدھر دھن پر
گیت گاتے، رقص کرتے
روشن آنکھوں والے بچّے
سب اپنے ہوں گے
جیون میں رس بھر دیں گے۔
یہ تھکے ماندے بوڑھے بچّے
جن کے پیروں کے نیچے
دُھول کے سمندر ہیں
ملگجی، مندی آنکھوں میں
کانٹے ہی کانٹے ہیں
بازاروں میں کھلتے پھرتے ہیں
اسکولوں کے اندر اور باہر
دھوکے اور چوری کے
ڈھیروں سبق رٹتے ہیں۔

کیا چرایا تھا؟

---

[1] سندھ میں خوشنما رنگین کپڑوں کو جوڑ کر چادر بنائی جاتی ہے جسے رلی کہتے ہیں

جوتا چُرایا تھا ؟
کہ گھنٹہ چُرایا تھا ؟
منصف اور قاضی پوچھتے ہیں
کیوں چُرایا تھا
یہ سوال
مقدمے سے باہر ہے
انصاف کا تقاضہ ہے
ایسے چور کے ہاتھ
کاٹنا ہی بہتر ہے
ملک کو
ہاتھوں کی نہیں
سجدوں کی ضرورت ہے۔

میری محبت !
جھنڈیوں کی صورت میں
ٹریفک کے اندھے جنگل میں
کھوکھلے ترانوں میں
لال پیلے ہرے
مصنوعی چراغاں میں
جلتی ہے
سلگتی ہے

تڑپتی ہے۔

اور تم
محبت کو اک مفلوج بوجھ بنائے
گردن میں ڈالے
بیٹھے ہو تھکے ہارے
پوچھتے بھی نہیں
سوچتے بھی نہیں
مانگتے بھی نہیں
لڑتے بھی نہیں

بولو......
چپ ہو کر ساتھ ہو
چیخو چلاؤ
سر ہی پٹخو!
کچھ تو بولو
یوں گم سم کب تک
ہاں دیکھو..... کب تک
بالوں میں جھلکتی باریک سفیدی
اور فی الحال یہ جسم جواں
تمہارے انتظار میں
آخر کب تک؟

ڈر ہے کہ کہیں
ڈھانچوں کے اس اونچے مینارے پر
اِک دن
آخری لاشہ بن کر لہرائے گا
گل سڑ جائے گا۔
اور
یادوں کا سچّا موتی بھی
دھندلا جائے گا
جھوٹا کہلائے گا۔

آخری موڑ

کیسے ہو؟ خوش ہو؟
بدل گئے یا وہی ہو؟
کیا تنخواہ وقت پر ملتی ہے
یا اب بھی
وہ تمھارا استحصال کرتے ہیں
صلاحیتوں کے خلاف کام لیتے ہیں۔
کیا نیند آجاتی ہے؟
کیا یادیں جگاتی ہیں؟
نرمی سے بھری وہ باتیں اور وعدے
جو خوابوں کی مانند سچے لگتے تھے
جب آخری موڑ پہ ہم تم بچھڑے تھے
وہ دن آج بھی زندہ ہے
تازہ اور روشن ہے۔

تم نے پوچھا تھا

کیا بھول جاؤ گی ان چمکتی راتوں کو
ہاں شائید ——
سردی میں ٹھٹھرتا اندھیارا
پھٹا پرانا بوسیدہ کمبل
شک شبہ اور کڑوا انتظار
چوبیس گھنٹوں کا فاقہ
اور روکھی سوکھی اس کے بعد
کڑوی کسیلی چائے کے گھونٹ
کمرے کی بے سر و سامانی
گھبراہٹ، خوف اور بے بسی
تلخی، محرومی اور تنہائی
سب بھول جاؤں گی۔

بس دھیمی سرگوشی اندھیرے میں
لپکتی باہیں
کھلتے بند ہوتے لب
آنکھوں کی دمک
پیار کا والہانہ پن
اس دل میں بسا رہے گا
ہر دم ساتھ رہے گا
مرنے نہ دے گا۔

وہ دیش ہمارا

سلاخوں کے پیچھے
بیڑیوں میں جکڑے
زنجیروں سے بندھے
دیش کی یاد میں تڑپتے ہیں
قید کی، درد کی، ظلم اور اذیت کی
ہر آواز دباتے ہیں
قیدی گاتے ہیں۔

وہ دیش ہمارا
جہاں پھول کھلتے تھے
کھیت مہکتے تھے
بچے دھومیں مچاتے تھے
پریمی رنگوں میں ہنستے تھے
کوئل گیت سناتی تھی
پر نہ جانے کیوں اور کیسے

وہ آئے
بے حس، بے رحم
کوئل کے پر کاٹ دیئے، اس کا گلا گھونٹ دیا
پھولوں کو مسل دیا
فصلوں کو کچل دیا
جوانوں اور مجبوباؤں کو
بچوں کی ہنسی اور شوخی کو
سچے اور نرم بولوں کو
فولادی تالوں میں بند کیا
پاتال میں اتار دیا۔

سلاخوں کے پیچھے
سنگینوں کی جھنکار پہ چھا جاتے ہیں
قیدی گاتے ہیں
سندھ کے ٹھنڈے مہربان پانی پہ
وہ پہلی رقاصہ
جھوم کے ناچی تھی
تکشلا میں نیلے آکاش تلے
شکتی اور شانتی کا
حسن اور ویدانت کا
سنگیت جاگا تھا

رگردھر اور اس کی مُرلی سے
رادھا نے پریم سیکھا تھا
پر نہ جانے کیوں اور کیسے
موت کے سوداگر آئے
پیار کی میٹھی بنسری کو
شانتی اور محبت کو
کالے کفن میں لپیٹ دیا
قبر میں اتار دیا۔

اب اس خالی اجاڑ دھرتی پہ
ظالم اور کٹھور ہی بستے ہیں
پھلتے پھولتے ہیں، عیش کرتے ہیں
صبح و شام جشن مناتے ہیں۔

غمزدہ، نڈھال اور زخمی
باجوں تاشوں کے وحشی شور میں بھی
دیش کے گیت گاتے ہیں
لڑنے والوں کی ہمت بندھاتے ہیں
پریمیوں کو کچھ یاد کراتے ہیں
قیدی گاتے ہیں۔

"بارہ فروری ۱۹۸۳ء"

(۱۲ فروری ۱۹۸۳ء کو لاہور کی خواتین نے قانونِ شہادت کے خلاف ایک جلوس نکالا جس پر پولیس نے تشدد کیا۔ یہ نظم اس واقعہ کے بعد لکھی گئی)

سنو مریم، سنو خدیجہ، سنو فاطمہ
سالِ نو کی خوشخبری سنو
اب والدین بچیوں کے جنم پہ
اُنہیں موت کے ٹیکے لگوائیں گے
کہ
قانون اور اختیار ان ہاتھوں میں ہے
جو پھول، علم اور آزادی کے خلاف
لکھتے ہیں، بولتے ہیں، فیصلہ سناتے ہیں
حاکم اور ثقہ مانے جاتے ہیں۔

ہاں سنو مریم، سنو خدیجہ، سنو فاطمہ!
آج وہ ایسا قانون بناتے ہیں
کہ آنکھوں سے لگاؤ
ہونٹوں سے چومو

احسان مانو اور شکرانہ ادا کرو۔
گھر کی ملکہ ہو
بچوں کی ماں ہو
سر جھکائے خدمت کرتی کتنی اچھی لگتی ہو
کیسی محفوظ اور پروقار ہو
بلند مقام اور جنّت کی حقدار ہو۔
اس لئے تمھارے بھلے کو بتاتے ہیں
"دو عورتوں کی گواہی" سمجھاتے ہیں۔
یوں تنہا نکلنا ٹھیک نہیں
آنا جانا مناسب نہیں
یہ حکم آسمانی ہے
جسے ماننا نجات کی نشانی ہے
جو اس سے انکاری ہے
ارتداد کا مجرم ہے
قابل گردن زدنی ہے۔

سڑکوں پہ نکلنا
لڑنا بھڑنا
آزادی کا حق مانگنا
نسوانی تقدس کے خلاف ہے
غنڈوں کا کام ہے

کیوں اس نازک وجود کو تھکاتی ہو
ہلکان کرتی ہو
چینی کی گڑیا ہو
نظروں میں آؤ گی
ٹوٹ کے بکھر جاؤ گی
تیز دھوپ میں پگھل جاؤ گی
عدالت میں سچی بات کہہ نہ پاؤ گی
شرم و حیا سے چپ ہو جاؤ گی
لاج کی ماری بے ہوش ہو جاؤ گی۔

ماتمی جھنڈیاں پھڑپھڑا رہی تھیں
کنیزیں باغی ہو گئی تھیں
وہ دو سو عورتیں
جو سڑکوں پہ نکلی تھیں
چاروں طرف سے گھری ہوئی تھیں
مسلح پولیس کے نرغے میں تھیں
آنسو گیس، رائفل اور بندوقیں
وائرلیس وین اور جیپیں
ہر راستے کی ناکہ بندی تھی
کوئی پناہ نہ تھی
یہ لڑائی خود ہی لڑنی تھی

وہ پالتو اور چہیتے
جمعیت کے غنڈے
جب سڑکوں پہ دندناتے تھے
آگ لگاتے لوٹ مار کرتے تھے
برچھے بھالے گھماتے تھے
شہریوں کو دھمکاتے تھے
تب یہ آہنی ٹوپی والے
دور سے دیکھ کر مسکراتے تھے
شفقت سے ہنستے تھے
بچّے ہیں.....
کہہ کر دودھ پلاتے تھے۔

عورت کا پیچھا چھوڑو
اور اپنی فکر کرو
یہ کھوکھلے اخلاقی بندھن اور ضابطے
اپنی حکمرانی کے واسطے
مجھے کیوں سمجھاتے ہو؟
کیا اسلام لانا اتنا مشکل ہے
کیا اب سے پہلے لوگ نماز نہ پڑھتے تھے
کیا روزہ نہ رکھتے تھے
یا قرآن اور کلمے کو نہ مانتے تھے؟

پھر کیوں جوانیوں کو برباد کرتے ہو
اتنے کٹھور اور ظالم بنتے ہو
بات بات پہ کوڑے مارتے ہو
اذیت پہنچاتے ہو۔

میں آزادی کا منشور پڑھتی ہوں
اور تم!
لکھا ہوا جو سامنے ہے
اتنا موٹا اور واضح ہے
نوشتۂ دیوار ہے
پڑھنے سے قاصر ہو۔

یہ تم نے کیسے سمجھا؟
کہ تم کو پیدا کرتی ہوں
اور تمھارے سامنے شرما کر، لجا کر
سچ کہنے سے گھبراؤں گی
زباں سے وہ سب ادا نہ کر پاؤں گی
جو ہم دونوں کے بیچ
محبت، نفرت، عزت اور حقارت کا رشتہ ہے
کیا عورت کی سچائی سے ڈرتے ہو؟
کیا میں ماؤف ہوں؟

یا ذہن میرا مفلوج ہے
کہ ساتھ کھڑی میری ہم جنس
مجھے یاد کراتی رہے
مجھے تو رتی رتی یاد ہے
تمھیں بھی یاد کرانا جانتی ہوں
یاد کرو.... کہ ظلم
قانون کے حوالے سے خوب پہچانا جاتا ہے
سمجھ میں آتا ہے۔

تم مجھ سے انساں کا درجہ چھینتے ہو
میں تمھیں جنم دینے سے انکار کرتی ہوں۔
کیا میرے جسم کا مصرف یہی ہے
کہ پیٹ میں بچہ پلتا رہے۔
تمھارے لیے اندھے، بہرے، گونگے
غلاموں کی فوج تیار ہوتی رہے
ہم جانتے ہیں کہ تمھارا ساتھ دے کر
ہم اپنے بچوں کی قبریں کھو دیں گے
اس لیے ہم تمھارا ساتھ نہیں دیں گے۔

تم دو کہتے ہو
ہم دو کروڑ عورتیں
اس ظلم اور جبر کے خلاف

گواہی دیں گے
جو قانونِ شہادت کے نام پر
تم نے ہمارے سروں پہ مارا ہے
ہم نہیں تم
واجب القتل ہو
کہ روشنی اور سچائی کے دشمن ہو
محبت کے قاتل ہو۔

پیدائش اور موت کے بیچ

(نوجوانوں کے عالمی سال پر)

پیدائش اور موت کے بیچ
فاصلہ کتنا کم ہے
بے حسی، بے دردی کی عمر
کتنی طویل ہے۔
اے ہوا
ان سے جا کر کہنا
ہم ظلم برداشت نہ کر سکے
اور موت کو گلے لگا لیا۔

اے سورج!
ہماری ماؤں سے کہنا
ان کی رسوائی پہ
ہم نے

سر جھکانا، آنسو بہانا
چھوڑ دیا
اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

ہاں اے ماں!
تو نے کیوں
اپنی رگوں میں درد سہہ کے
ہمیں پیدا کیا
خوش ہو کے پالا
اور ہماری دمکتی جوانی پہ
غرور کیا۔
کہ آج
جنہوں نے تیرا سودا کیا
ہماری تقدیر کے مالک بن بیٹھے۔
ہماری جواں مرگی سے
اپنی مفلوج عمریں بڑھانے لگے۔

کیا معصومیت کا جرم
اتنا سنگین ہوتا ہے؟
کیا بچپن کو
سولی پہ چڑھایا جاتا ہے؟

اے ماں!
تو کتنے آنسو بہائے گی
کہ تیری آنکھوں کے نور
اور دھرتی کے پھول
یہاں صبح و شام
خاک میں مل جاتے ہیں۔

اے صبح کی آواز
ان سے جاکر پوچھو
کیا وہ بے جان پتلے ہیں؟
یا شہر کا شہر ہی
جنازوں کا قافلہ ہے۔

ان سے کہنا
کہ ہمارا ماتم
سرگوشیوں میں کرنا چھوڑ دیں
اور غصے کی آگ سے
آنسوؤں کو شعلہ بنالیں۔

ہاں اے دوستو
تم جس اذیّت سے

دن رات گزرتے ہو
اس پہ
خدا بھی چلّا اٹھتا ہے
پھر تم کیوں چپ ہو؟

یہی خوف ہمیں ڈستا ہے
کہ تم جو خاموش رہے
تو اب کے برس
قربانی کے لئے
انہوں نے
کیسے کیسے جوانوں کو
چن رکھا ہے۔

اِنصاف

اُس صبح
جب تم سے ملنے آئی تھی
خوف سے کانپتی
وحشت سے لرزتی
جلتے کوڑے کے ڈھیر سے
اٹھتے دھوئیں میں بھی
جن، بھوت، چڑیلیں
دکھائی دیتی تھیں
ڈستی تھیں خون سکھاتی تھیں
میں ٹھٹھر کر رک جاتی تھی۔
چوراہے پہ اکڑتے سپاہی
کاروں میں بیٹھے افسر

وردیوں پہ چمکتے دھات کے ٹکڑے
چیختی چنگھاڑتی
دھواں اگلتی سواریاں
پھاٹک میں جھکے دربان
چالاک اور ہوشیار دکاندار۔

دیواروں پہ چسپاں پوسٹر
ستونوں میں جڑے وہ لفظ
"جینا ایک فحاشی ہے
سانس لینا، نگاہ اٹھانا، خواب دیکھنا
اور سوچنا عریانی ہے"

ہونٹ خشک ہو رہے تھے
گلے میں کانٹے چبھ رہے تھے
اور سب انجانے لوگ
پیچھا کرنے والے
رنج اور اذیت پہنچانے والے
دشمن اور جاسوس لگتے تھے۔
ہر قدم پہ رکتی تھی
مڑ مڑ کر دیکھتی تھی
پھر بھی بڑھتی جاتی تھی

تھکے شل قدموں سے
سیڑھیاں چڑھتی جاتی تھی۔

خوف کی تکان تھی
محبت کی پکار تھی
کانوں پہ ہاتھ رکھا

آنکھوں کو بند کیا
اب تو آگے بڑھنا ہے
محبت میں مرنا ہے
وہ آئیں
کوڑے، پھندے اور پتھر لئے
جان ہی تو دینی ہے
آج یہی ٹھانی ہے۔

یہ بھی کوئی جینا تھا
کیسی ذلت اور خواری تھی
سالن میں نمک نہ ہونے پر
ہنسنے اور اونچی آواز میں بولنے پر
صبح دیر سے آنکھ کھلنے پر
اپنی مرضی سے کچھ کرنے پر

وہ مارتے مارتے
جان نکال دیتا تھا
جسم داغ دیتا تھا
دماغ سُن کر دیتا تھا
یہ کیسی ریت تھی
جھڑکیاں، گالی، مار اور طعنے
اور پھر بھی،

ہاں پھر بھی!
اسی کے ساتھ رہنا تھا
جینا اور مرنا تھا
سر جھکا کے خدمت کرنا تھا
اور سب کچھ سہتے سہتے
اپنے آپ کو کھونا تھا۔

اس حقارت اور بے دردی میں
جانوروں سے بدتر حالت میں
تم نے کچھ نرمی سے
پیار اور ہمدردی سے
اس دل کو سمجھا
روح میں اٹھتے طوفاں کو

گھٹن اور محرومی کو
عزت اور سہارا دیا۔

اب تم سے بڑھ کر
کوئی بھی اپنا نہ تھا
جیون میں پہلی بار
اپنی خوشی اور مرضی سے

تھوڑی سی عزت کی خاطر
محبت اور آزادی کی خاطر
ہر زنجیر توڑ کے آئی ہوں
سب کچھ چھوڑ کے آئی ہوں
سب کچھ تمھیں سونپنے آئی ہوں۔

جب کمرے میں آئی
ذرا سا کھٹکا بھی
اٹھی دھماکا تھا
تمھیں!
انتظار میں بیٹھا دیکھ کر
گو ہاتھ ابھی تک ٹھنڈے تھے
اور دل کی دھڑکن

گونج بن گئی تھی
انگلیوں کا چھونا تھا
ہاتھوں کا ملنا تھا
کہ اب
کوئی بھی دشمن نہ تھا۔

سڑک پر چلنے والے
دنیا میں بسنے والے

اجنبی اور مسافر
پیار کے رنگ میں ڈوبے
سب اپنے لگتے تھے۔
زندگی گاتی اور تھرکتی
کھلکھلاتی اور اِٹھلاتی
پیاری سہیلی تھی
گردن میں دمکتی باہیں ڈالے
جھوم اٹھی تھی
مہک رہی تھی۔

"آؤ یہاں بیٹھو
میرے پاس"

سر جھکائے آگے بڑھی
میرے کانپتے ہاتھوں کو
اپنے ہاتھوں میں تھاما۔
"آؤ میرے پاس
اتنا کیوں گھبراتی ہو

پیار اور محبت میں
خوشی اور مسرت میں
گھٹن اور پریشانی
پھانسی کے دو پھندے ہیں

آؤ نظریں ملاؤ
کچھ مسکراؤ
سب بھول جاؤ
آؤ.......
ہاتھوں میں ہاتھ تھامے
ہنستے گاتے دھوم مچاتے
سڑکوں پہ گھومیں
چڑیوں کو گاتے
سورج کی کرنوں میں تازہ اوس چمکتے
بادلوں کو سمندر سے اٹھتے
پہاڑوں کی سمت تیرتے

دیکھیں!
مرلی کی اداس لے پر
کوئی بھولی بسری یاد گنگناتے
گول گول گھومتی اس دھرتی پر
محبت کا اظہار کریں"

میں نے
آنسو بھری آنکھوں سے
بند دروازے کو دیکھا
اظہار ؟ محبت کا ؟

ان سڑکوں پہ ؟
ناممکن ہے
اونچے ایوانوں میں
بند کمروں میں
چھپتے بندوں کا
ہر گناہ نعمت ہے
اوپر والے کی برکت اور عنایت ہے
کھلی سڑکوں، شہ راہوں اور میدانوں میں
محبت جرم بن جاتی ہے
گندگی کہلاتی ہے۔

چاروں طرف پہرے ہیں
سوچ پر، محبت پر
تازیانے اور کوڑے
ہنسنے مسکرانے پر
خوف کی اس تنہائی میں
بے بسی محرومی میں
سب ہی دشمن لگتے ہیں
نہ جانے کب
ہاتھ پاؤں باندھ کر
عدالت کے کٹہرے میں
کھڑا کر دیں۔

"تم پہ الزام ہے محبت کا
جسم و جاں نچھاور کرنے کا
ایک ایسے شخص پہ
جو قانون اور مذہب کی رُو سے
تمہارا رکھوالا اور مالک نہیں
تمہارے جسم کا روح کا، دل کا
حقدار نہیں۔"

لیکن میں نے اپنی مرضی سے

سب کچھ اسے سونپا ہے
اس کے میٹھے بول ہیں
پیار اور ہمدردی ہیں
درد اور زخموں سے چُور
کچلی ہوئی یہ روح اور دل
کچھ سنبھلنے لگے
عزت اور انسانیت کی
آرزو کرنے لگے۔
وہ پہلے والا کون تھا

میں نے کب جانا تھا
نکاح کے دو بول پڑھے
دام کھرے طے ہوئے
اور میں اس کی مرضی پر
آنکھ کے اشارے پر
ہاتھوں کی جنبش پر
سر جھکائے
حکم مانتی رہی
ذلّت کی اذیت میں جلتی رہی
اُف کرنے سے بھی ڈرتی رہی۔

"وہ تمہارا شوہر تھا
نگہبان، مجازی خدا تھا
ظلم اور جبر کرنے کا
اپنی مرضی تم پر تھوپنے کا
ہر اختیار رکھتا تھا
لہٰذا یہ عدالت
شرع اور انصاف کی روشنی میں
بدکاری کے جرم میں
تمھیں!
بیس کوڑوں کی
سزا سناتی ہے"

بڑی مشکل سے برف پگھلی ہے

بڑی مشکل سے برف پگھلی ہے
اس لمحے کی عمر کتنی تھوڑی ہے
ہر خوشی جیسے کہ اب میری ہے۔

اس دلنواز موسم میں
ان چمکتے لمحوں میں
میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں
نرمی سے تھاما تھا۔
آہستہ ......آہستہ
آنکھوں کو چوما تھا۔

پیار کی ان سنہری شاموں پہ

امر ہوتی مہکتی سانسوں پہ
کتنی تیزی سے
خوف کی رات چھانے لگی
جدائی کی عمر بڑھنے لگی
برف پھر سے جمنے لگی۔

اُس دلنواز موسم کی
اُن چمکتے لمحوں کی
عمر کتنی تھوڑی تھی
بڑی مشکل سے برف پگھلی تھی۔

لیکن اِس اندھیرے میں
مایوسی کے کہرے میں
صدیوں کی تنہائی میں
وہ لمحہ ہی زندہ رہتا ہے
پیار سے مسکراتا ہے
اک یقیں دل میں سر اٹھاتا ہے
مشکلوں سے جو برف پگھلی تھی
اب کبھی جم نہ پائے گی
وہ خوشی جو کہ میری اپنی تھی
بہت جلد لوٹ آئے گی۔

"ننھا فرشتہ"

چھوٹا سا بچہ
وہ ننھا فرشتہ
بے بس، بے گھر
چلنے سے مجبور
اٹھنے سے معذور
آنکھیں موندے
مٹھی تانے
چونچ برابر منہ کھولے
چادر میں لپٹا
نہ جانے کون اور کب
کس مجبوری میں
آس اور مایوسی میں

چھوڑ گیا تھا
مسجد کے سائے میں۔

خدا کے گھر سے
کوئی تو نکلے گا
بے بسی، بے کسی کی اس گھڑی کو
ہاتھوں میں تھامے گا
سینے سے لگائے گا
انگلی پکڑ کے
جینے کا ڈھنگ سکھائے گا۔

اور نہیں تو
بیس قدم پر تھانہ ہے
قانون اور انصاف کے رکھوالے آئیں گے
ہلتی ڈولتی گردن کو تھامیں گے
بہلائیں گے پھسلائیں گے
کوئی گھر بھی ڈھونڈ ہی لیں گے۔

وہ نکلے
پیشانی پر سجدوں کے نشان سجائے
کلمہ پڑھتے، درود گنگناتے

انگلیوں پہ تسبیح کے دانے گھمانے
غصہ میں منہ سے جھاگ اگلتے
نفرت میں تھر تھر کانپتے۔
چادر میں لپٹی یہ روح شیطانی
معصومیت کے بھیس میں بلا ناگہانی
کون جانے
سفید چادر کے اندر
نوکیلے دانتوں والا
سینگوں اور خونی پنجوں والا
اک شیطان چھپا ہے
ہماری نمازوں کو
عبادت اور طہارت کو
آلودہ کرنے
کوئی چھوڑ گیا ہے۔

آؤ
اس سے پہلے کہ یہ عفریت
چادر سے نکلے
جیون کا امرت پیئے
اور ہمارے سینوں پر مونگ دَلے
اسے کچل دیں

لیکن دیکھو دور سے
پاس جاؤ گے
رحم اور ہمدردی کے
طلسم میں گھر جاؤ گے
مار نہ پاؤ گے۔

"دور سے؟ لیکن کیسے؟"
تسبیح کو کلائی میں اٹکا کر
انگلیوں میں پتھر تھام کر
بولے
"ایسے!"
ایک ننھا سا گدگدا ہاتھ
باہر نکلا
مٹھی کھلی ہاتھ نیچے گرا
ہاں!
ایسے..... ایسے..... ایسے.....

ایک ساتھ
بہت سے پتھر
اس چھوٹے سے بچے پر
ننھے فرشتے پر

برستے رہے۔
چادر کے اندر
بے آواز، بے صدا
نہ ہلا نہ جلا
نہ جانے کب
اِس دنیا سے چلا گیا۔

فرشتوں نے
معصوم بے زبان روح کو
اُس کے حضور پیش کیا۔
نرمی اور محبت سے
اٹھا لیا جھک کر
اور گلگلے گالوں کو
تھپتھپا کے پوچھا
اتنی بھی کیا جلدی تھی
ابھی ابھی تو آنکھ کھلی تھی
روشن روشن اور چمکیلی
کیوں لے آئے؟ جینے دیتے
ہنسنے اور کھیلنے دیتے
دنیا میں کچھ اُجالا پھیلنے دیتے

فرشتوں نے ہاتھ باندھے
اے خدا ' اے ربّ العالمین
تیری دنیا میں
مسکرانے اجالا پھیلانے والوں کو
نیکی اور محبت کو
پاکیزگی اور معصومیت کو
تیرے نام لیوا اور تیرے بندے
سنگسار کر دیتے ہیں
مسجد کے سائے میں۔

تاج محل

سردیوں کی دھندلی صبح تھی
سڑک کے دونوں جانب
گیہوں اور سرسوں جھومتی تھی
سفیدے کے اونچے پیڑ
کہرے کو گھمبیر بناتے تھے
پھولوں سے لدی گاڑیاں
بستی کی جانب جاتی تھیں
پیلے دہکتے سورج جیسے
گیندے کے پھول!
دیوتا کے مندر میں
دیوی کے چرنوں میں
پیار کی جے مالا بن کر
کسی گردن میں مہکنے
اور شمشان کی آگ بن کر

کسی چیتا میں جلنے جاتے تھے

آگرے کی پرانی گلیوں میں
اکتائے سست مزاج لوگ
جاگتے تھے، انگڑائی لیتے تھے
کوچ میں بیٹھے ہم سفر
آپس میں باتیں کرتے تھے
کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟
اس سے کچھ مطلب نہ تھا
پُورب، پچھم، اتر، دکن
کہیں کی رہنے والی ہوں
اسی دیس کی باسی ہوں۔

آنکھیں بند کر لو اور سوچو.....
ہاں سوچو.....
کہ تم کون ہو؟
اڑتیس برسوں کا یہ جیون
کہاں لے آیا؟ کیوں لے آیا؟
ماں! یہ کیسا جنم دیا
کہ گھر میں ہی گھر نکالا ملا

چھ.... سات.... آٹھ
رات کے دس...
اب بارہ بجنے والے ہیں
پیروں کی چاپ
پاس آتی ہے' دور ہو جاتی ہے
تم آئے ہو؟.....
نہیں ہوا کا جھونکا تھا۔

اُف دروازے پہ کھڑا میرا وہم
اعتماد کو پارہ پارہ کرتا ہے
ٹھنڈا اکیلا کمرہ
گلا دبائے دیتا ہے
خودکشی پہ اکساتا ہے۔

سب کچھ تو دے ڈالا تھا
قدموں میں لا پھینکا تھا
پھر......
اس چالاکی کی کیا ضرورت تھی
کیوں اتنا جھوٹ بولا تھا
یہ کیسا دھوکا تھا؟
سوچ رہی تھی

کاش! نفرت کا یہ زہر
جیتا جاگتا خون نہ بنتا
کاش! آج کا دن
گزرا ہوا کل ہوتا
جب ہر لڑائی جھگڑے کے بعد
محبت بڑھ جاتی تھی
پیار کا امرت بہنے لگتا تھا
ہم ایک ہو جاتے تھے
گلے مل جاتے تھے
کبھی نہ بچھڑتے تھے۔

تم نے یہ کیا کیا؟
دولت اور جھوٹی انا کی خاطر
اپنی بڑائی اور کھوکھلی شہرت کی خاطر
دونوں کے گھر لٹا دیئے
اجنبی، انجان بنا دیئے
یہ ہمیشہ کا بچھڑنا
ساتھ چھوڑ دینا
منافقت، شک اور شبہ
دن رات کی اذیت بنا
صدیوں پرانے رشتے کو

جیون اور میری جنم بھومی کو
بار بار
نفرت کے گھپ اندھیرے میں
پیچھے دھکیل دیتا ہے
قتل کر دیتا ہے
کیوں اس بے دردی سے
کٹرپن اور تنگ نظری سے
ان دمکتے جذبوں کو قتل کیا
دلوں اور چہروں کو اتنا کٹھور بنا دیا
کہ اب
حقارت کے سوا
تمہارے لئے
اس دل میں کچھ بھی نہیں۔

آنکھیں کھولو، دل نہ دکھاؤ
آج اور آنے والے کل کو دیکھو
سب رشتے کتنے ملتے ہیں
ویسے ہی کھنڈر ہیں
راجوں، مہاراجوں اور شہنشاہوں نے چھوڑے ہیں
ویسی ہی کچی پکی نہروں میں
پانی بہتا ہے

کسان ہل چلاتے ہیں
مزدور گھر بناتے ہیں۔
یادوں کا تاج محل
دور ہوتا جاتا ہے
پاس آتا جاتا ہے۔

ہلو میڈم....
ہیلو.....، ہیلو....
لے جاؤ سنگ مرمر کا یہ تاج!
تیس روپے میں
اچھا بیس روپے میں

تاج تو اس دل میں ہے
درد میں ڈوبا میرا تاج
کیا دام لگاؤ گے اس کے
بے دام ہی تم کو دیتی ہوں
لیکن اس دنیا میں
بے مول کسی کی قدر نہیں
ہیرے، پتھر، سونے چاندی میں لپٹے
باہر سے بند، اندر سے کھوکھلے
تاج محل ہی پوجے جاتے ہیں

یہ بیچنے والے کیا جانیں
جذبے اور ہمت کا پیار
جب اونچا ہوتا ہے
تاج محل بن جاتا ہے
آکاش بھی جسے
جھک کر چوم لیتا ہے۔

محبت اور محرومی کا
پیار اور مایوسی کا
وہ تحفہ!
شاہجہاں نے دیکھا قید خانے سے
آرزوؤں کا خزانہ
ناکام خواہشوں کا افسانہ
اور بیچ میں جمنا کا دھارا۔
زرنگار چھت کے نیچے
گائیڈ کہہ رہا تھا
انہیں محرابوں اور گھاس کے خطّوں پر
کبھی مینا بازار سجتا تھا
شہزادیاں جمع ہوتی تھیں
سنورتی تھیں، اٹھلاتی تھیں
داستانیں بنتی تھیں، بگڑتی تھیں

اب گونجتی یادوں اور دالانوں کے سوا
کچھ بھی نہیں
دربار عام میں
سرگوشی بھی
دور تک سنائی دیتی ہے ۔

تم نے کیوں دل کی اس دھڑکن کو
برباد اور ریزہ ریزہ
یوں بکھرنے دیا
دیواروں سے ٹکرانے دیا ۔

لوگ آتے ہیں
کھمبے اور گنبد گنتے ہیں
پیسے دیتے ہیں، دیئے جلاتے ہیں
پھول چڑھاتے ہیں
پتھر کے نیچے
کسی کا دل دھڑکتا ہے
محبت میں تڑپتا ہے
یادوں کے ہیرے موتی
تاج محل بن جاتے ہیں
یادیں !

آنسو بن کر گرتی ہیں
"یہ پھول لے لو!"
سینے میں دہکتی آگ کے پھول
کس کو دوں؟ کس پہ نچھاور کر دوں؟
لگتا ہے جل جاؤں گی
بھسم ہو جاؤں گی۔

دل میں اترتا
غمزدہ حسن
بڑھ کر سنبھال لیتا ہے
تنہائی اور دکھ کو مٹاتا ہے
بھانت بھانت کی بھاشا بولنے والے
دیسی، پردیسی، گورے، کالے
امیر، غریب دوست اور دشمن
ہر مذہب اور ملت والے
جھروکوں، میناروں کو دیکھتے ہیں

دم بخود رہ جاتے ہیں
دم بخود کیوں؟
پیار کا کرشمہ تو
سات آسمانوں سے
ستارے توڑ کر
دھرتی کے اندھے رستوں کو
کہکشاں بنا سکتا ہے
ہر تاریک دل کے اندر
اک سورج چمکا سکتا ہے۔

وہ پردیسی لیٹرے
لالچی اور تاجر
لوٹنے کھسوٹنے کے ماہر
اِس میٹھی یاد کو
نوچ ڈالنا چاہتے تھے
اکھاڑ لے جانا چاہتے تھے
پھر بھی تاج چمکتا رہا
پیار کا انمٹ شعلہ سلگتا رہا۔

کبھی ہیرے موتی سے جڑے
اب زخمی یادوں کے داغ بنے

خالی گڈھوں میں
انگلیاں ابھریں اور ڈوبیں
تب صدیوں پرانی وہ انگلیاں
محنت کرنے والوں کی
پتھر میں روح پھونکنے والوں کی
دھرتی کے پالن ہاروں کی
جیون کا سندیسہ بن کر
دوڑ گئیں نس نس میں
تیس برسوں کی محنت
تین نسلوں کی ہمت
کیا جانتے ہوں گے
کہ اک روز
ان کی ہمت اور قربانی
اس دنیا میں
پیار کی سوغات بن جائے گی
رنگ، نسل، مذہب اور طبقے سے اوپر اٹھ جائے گی۔

کیا کچھ بیت گیا
اس سہانی یاد پہ
مغلوں کا زوال
غدر کا خون خرابہ

انگریز بہادر اور کمپنی کا راج
صدیوں کی لوٹ مار
تقسیم اور آزادی
آپسی نفرت اور بربادی
پھر بھی
محبت کی یہ پاکیزہ نشانی
آنے والوں کی ڈھارس بن جاتی ہے
ان اندھے، دھکتے دیتے سالوں میں بھی
انساں کو انساں بننا یاد کراتی ہے۔

تہ خانے میں
قبروں پہ لرزتی دیئے کی لو
بجھتی ہے
بھڑکتی ہے
پھر جل اٹھتی ہے۔
شان و شوکت کے نیچے
اداسی، محرومی کا
حسرت اور مایوسی کا
یہ دھارا
غمگیں اور پُر یقیں

آزادی کا تڑپتا جذبہ ہے
بے بسی کی اوس کو جھٹکتا ہے
تاج کی مانند
ہر دل میں دھڑکتا ہے۔

”آؤ پہلے رقص کریں“

پیار کی نیلی بارشں میں
ہم نے
ہاتھوں کو لہرایا۔
آؤ پہلے رقص کریں
بعد میں کیوں پچھتائیں۔
تم نے مجھے
غور سے دیکھا
دیوانہ سمجھا۔

سالوں سے جن بچوں کو
مَیں ترسی تھی
وہ دل کے ٹکڑے
میرے پیار کی چھایا میں

لاڈ بھرے ارمانوں میں
پیدا ہوئے
نند لعل بنے۔

اُن شوخ حسین جوانوں کو
چنچل، ہنستی عمروں کو
وہ
گولیوں کی بوچھاڑ میں
کوڑوں کی مار میں
ڈسپلن سکھانے
سیدھے رستے پہ چلانے
تابع اور فرماں بردار بنانے
آئے
تم نے
میرے ارمانوں کو خوں ہوتے دیکھا
اور نظروں کو جھکائے رکھا۔

صدیوں سے
تمھارے من میں جو سمایا ہے
وہ کر ہی ڈالو
خوف سے ٹکرّ لے ہی لو۔

ہاں آؤ آج
اِن سبھے قدموں میں
رقص کی مستی کو بھر لو
ہاں آؤ آج
ہم پہلے اتنا رقص کریں
بعد میں کیوں پچھتائیں۔

سعید گزدر کی دوسری کتابیں

ملاح کی بیوی

آگ گلستاں نہ بنی

طوق و دار کا موسم

آدھی گواہی

پڙهندڙ نسُل . پ نَ

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾ عبداللہ حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻڪَ ”لُڙهندڙ نَسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ ٿئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻرندڙ، چُرندڙ، ڪِرندڙ، اوسيئڙو ڪندڙ، ياڙي، ڪاٺُو، ياجوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سَگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سڀني وِچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان کڻي ڪمپيوٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعنی e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌائڻ، ويجهڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاري تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پڙهندڙ نَسل (پَـنَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪـو بہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهـڙي دعوىٰ ڪري ٿـو تـہ پَڪَ ڄاڻو تـہ اُهو ڪُوڙو آهـي. نہ ئي وري پَـنَ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪڏهن ڪو اهڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو بہِ ڪُوڙو آهي.

جَهڙيءَ طَرَح وڻـن جا پَنَ ساوا، ڳاڙها، نيرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اُهڙيءَ طرح پَڙهندڙ نَسُل وارا پَـنَ بہ مختَلِف آهـن ۽ هوندا. اُهي ساڳئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، بَرندڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وِڙهندڙ ۽ پڙهندڙ بہ ٿي سگهن ٿا. پين لفظن ۾ پَنَ ڪا خُصوصيِ ۽ تالي لڳل ڪِلَب Exclusive Club نہ آهي.

ڪوشش اها هوندي تہ پَـنَ جا سڀ ڪَم ڪار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آهي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تي بہ ٿِين. اهڙي حالت ۾ پَـنَ پاڻ هِڪَڀِئي جي مدد ڪَرڻ جي اُصولَ هيٺ ڏي وَٺُ ڪندا ۽ غيرتجارتي non-commercial رهندا. پَنَن پاران ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.

ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز ڪرڻ کان پو ٻيو اهم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪڏهن ڪو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تہ ڀلي ڪمائي، رُڳو پَنَن سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَنَن کي کُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٽاندڙ وڏِ
کان وَڏِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکَڪَن، ڇپائيندڙن ۽
ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳِئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ
کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽَ کي نہ مڃن.
شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻَ، سمجهہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽَ،
پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ
جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:
گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.
... ...
جٺن جٺن جاڙ وڏي ٿي جَڳَ ۾، هو بوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا:
ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موتي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا:
... ...
ڪالهہَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهہ نيلا پيلا آهن:
گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن........
... ...
هي بيتُ اَٿي، هي بَم- گولو،
جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!
مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،
جنهن رِڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَّ ۽ چَمَ جو ساٿي آ -
اِن حسابَ سان اٽڃاٽائي کي پاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ
”هاٽي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ
وڃايو“ ناداني‌ءَ جي نشاني آهي.

پَنَن جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۽ سماجي حالتن تان نظر ڪڇي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اڻڄاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَنَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پڙهندڙ نَسُل جا پَنَ سيني کي **ڇو، ڇالاءِ ۽ ڪيئن** جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوشَ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽٽر گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا. بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ياڪِي پائي چيو تہ ”منهنجا ياءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ“.
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)